

تفہیم القرآن

عَبَسَ

نام | پہلے ہی لفظ عَبَسَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | مفسرین و محدثین نے بالاتفاق اس سورہ کا سبب نزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکہ معظمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضور اُن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابن ام مکتوم نامی ایک نابینا حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضور کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوتی اور آپ نے اُن سے بے رنجی برتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سُورۃ نازل ہوئی۔ اس تاریخی واقعہ سے اس سورہ کا زمانہ نزول باسانی مستقیم ہو رہا ہے۔

اولاً یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم بالکل ابتدائی دور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اسلمہ بملکۃ قدیمًا، اور هو ممن اسلمہ قدیمًا، یعنی یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مکہ معظمہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔ ثانیاً حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، ان میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اسلام لاپکے تھے اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے اور تلاشِ حق میں حضور کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے آکر عرض کیا تھا یا رسول اللہ، اَرشدنی ۛ یا رسول اللہ، مجھے سیدھا راستہ بتائیے (ترجمی)

حاکم، ابن جبان، ابن جریر، ابویعلیٰ)۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ وہ اگر قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضور سے عرض کیا یا رسول اللہ علمنی مما علمک اللہ

”یا رسول اللہ مجھے وہ علم سکھاتیے جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے“ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ابن زید آیت ۳ کے الفاظ لَعَلَّہُ یَیْزُکِیٰ کا مطلب لَعَلَّہُ لَیْسَ لَہُ شَیْءٌ کہ شاید وہ اسلام قبول کر لے“ بیان کرتے ہیں (ابن جریر)۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ منقہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جلتے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو؟ اور یہ کہ ”جو غود تہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رنجی رہتے ہو“ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے اندر طلبِ حق کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، وہ حضور ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ اُن کی یہ طلب یہیں سے پوری ہوگی، اور یہ بات ان کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انہیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثنا حضور کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہمیں عثیبہ، شیبہ، ابو جہل، اُمیہ بن خلف، ابی بن خلف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا، اور شکستِ اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ یہ سب امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورتہ بہت ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | بظاہر کلام کے آغاز کا انداز بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رنجی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجیہ کرنے کی بنا پر اس سورہ میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سُنوۃ پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے نیکبر اور مٹ دھری اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضور کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نایاب سے بے رنجی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرت تو جھکنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو مغرور اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج غلطی آپ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُجحان اس طرف ہوتا ہے کہ تو تم کے با اثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرز عمل ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک مزلسرِ اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس دعوت کے نقطہ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتنے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فرود تر ہے کہ آپ اسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔

یہ آغازِ سورۃ سے آیت ۶ تک کا مضمون ہے۔ اس کے بعد آیت ۷ سے براہِ راست عتاب کا سٹخ ان کفار کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ اس میں پہلے اُس رویتے پر انہیں ملامت کی گئی ہے جو وہ اپنے خانی و رازق پروردگار کے مقابلے میں برت رہے تھے، اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز وہ اپنی اس روش کا کیسا ہوناک انجام دیکھنے والے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا جہرمان اور رحم فرمانے والا ہے
 ترش رو ہوا اور بے رنجی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر شاید
 لے اس پہلے فقرے کا انداز بیان عجیب لطف اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ بعد کے فقروں میں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے کہ ترش روئی اور بے رنجی برتنے کا یہ فعل حضور ہی سے صادر ہوا تھا، لیکن کلام کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضور نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے اس فعل کا صدور ہوا ہے۔ اس طرزِ بیان سے ایک نہایت لطیف طریقے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپ کے اخلاقِ عالیہ کو جاننے والا اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رویتے کا ترکیب ہو رہا ہے۔ جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، جیسا کہ ہم ویساچے میں بیان کرتے ہیں، مشہور صحابی حضرت ابنِ امّ مکتوم ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں اور حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ امّ مکتومیں حضرت فدیکہ کے ماموں زاد بھائی تھے، ان کی ماں امّ مکتوم اور حضرت خدیجہ کے والد خویلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضور کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہوجانے کے بعد اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ نے ان کو خیر یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رنجی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضور کے اپنے برادر نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرسے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے ساتھ یہ رویتہ اختیار کیا، لفظ اعمیٰ (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضور کی بے اعتنائی کے سبب کی

وہ سُدھر جلتے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی بڑھاتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دُور آتا ہے اور وہ دُور رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رنجی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک

جثیت سے خود بیان فرمایا ہے یعنی حضور کا خیال یہ تھا کہ میں اس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پالے تو اسلام کی تقدیرت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، بخلاف اس کے ابنِ مکتوم ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر ان سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اس لیے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

۳۔ یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اکرمؐ کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل پر گزرت فرمائی، پھر آپ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں تحقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف تبارہی ہے کہ وہ طالبِ حق ہے، اس بات سے دُور رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دُور راہِ شخص ہے جس کا رویہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کے اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اس متابعِ گمراہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، ٹنگٹا ہو، ٹولا ہو، فقیر بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اُسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے، اور اُس شخص کا حال یہ تبارہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کر لے گا۔ یا

نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاموں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔

دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بااثر ہو، اُس کے پیچھے پڑنے کی داعی حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سدھنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سدھنا چاہے تو نہ سدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعی حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

۳ یعنی ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر چھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو۔ نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے اُس کے سامنے اسے بالاجب پیش کیا جائے اور نہ تمہاری یہ شان ہے کہ ان مغرور لوگوں کو اسلام کی طوط لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمہاری کوئی عرض ان سے اُلکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمہاری دعوت فروغ پا سکے گی ورنہ ناکام ہو جائے گی۔ حق ان سے اتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

۴ مَراد ہے قرآن۔

۵ یعنی ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں۔ ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے کسی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار و نظریات ان میں راہ نہیں پاسکے ہیں۔ جن گندگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کر دی گئی ہیں اُن کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہو سکا ہے۔ انسانی تخلیات ہوں، یا شیطانی دباؤں اُن سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

۶ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کے ان صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہدایت کے مطابق لکھ رہے تھے، اُن کی حفاظت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انہیں جوں کا توں پہنچا رہے تھے۔ ان کی تعریف میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک کَرَام، یعنی مُعَزَّز۔ دوسرے بَار، یعنی نیک۔ پہلے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اتنے ذی عزت ہیں کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں ذرہ برابر خیانت کا صدور بھی اُن جیسی بلند پایہ ہستیوں سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان

لعنت ہو انسان پر، کیسا سخت منکر حق ہے یہ۔ کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفہ کی ایک بوند سے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی، پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان صحیفوں کو لکھنے، ان کی حفاظت کرنے اور رسول تک ان کو پہنچانے کی جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اُس کا حق وہ پوری دیانت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

۷ جس مسئلہ بیان میں یہ آیات اُترنا دہوتی ہیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ قرآن مجید کی یہ تعریف محض اُس کی عظمت بیان کرنے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ اہل مقصود اُن تمام تکبر لوگوں کو، جو حقارت کے ساتھ اس کی دعوت سے مُنہ موڑ رہے ہیں، صاف صاف بتا دینا ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ تمہاری حضوری میں اسے پیش کیا جائے اور تم سے یہ چاہا جائے کہ تم اسے شرف قبولیت عطا کرو اور تمہاری محتاج نہیں ہے بلکہ تم اس کے محتاج ہو۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو جو خناس تمہارے دماغ میں بھرا ہوا ہے اسے نکال کر سیدھی طرح اس کی دعوت کے آگے سر تسلیم خم کر دو۔ ورنہ جس قدر تم اس سے بے نیاز بنتے ہو اُس سے بہت زیادہ یہ تم سے بے نیاز ہے۔ تمہاری تحقیر سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا، البتہ تمہاری بُرائی کا سارا گھنڈ خاک میں ملا کر رکھ دیا جائے گا۔

۸ یہاں سے عقاب کا رخ براہ راست اُن کفار کی طرف پھرتا ہے جو حق سے بے نیازی برت رہے تھے۔ اس سے پہلے آغازِ سورہ سے آیت ۶۱ تک خطابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور عقاب درپردہ کفار پر فرمایا جا رہا تھا۔ اس کا انداز بیان یہ تھا کہ اے نبی، ایک طالبِ حق کو چھوڑ کر آپ یہ کن لوگوں پر اپنی توجہ صرف کر رہے ہیں جو دعوتِ حق کے نقطہ نظر سے بالکل بے قدر و قیمت ہیں اور جن کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جیسا عظیم القدر پیغمبرِ قرآن جیسی بلند مرتبہ چیز کو ان کے آگے پیش کرے۔

۹ قرآن مجید میں ایسے تمام مقامات پر انسان سے مراد نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی ناپسندیدہ صفات کی مذمت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ "انسان" کا لفظ کہیں تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسانی کے اکثر افراد میں وہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں، اور کہیں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعین کے ساتھ اگر ملامت کی جائے تو ان میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے نسیوت کا طریقہ

کی، پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔ ۱۱۔ ہرگز زیادہ مؤثر ہوتا ہے کہ عمومی انداز میں بات کہی جائے دفریہ شرح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، طم السجدہ، حاشیہ ۶۵۔ الشوری، حاشیہ ۷۵۔

۱۲۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کس چیز نے اسے کفر پر آمادہ کیا؟ یعنی با الفاظ دیگر کس بل بوتے پر یہ کفر کرتا ہے؟ کفر سے مراد اس جگہ حق کا انکار بھی ہے، اپنے محسن کے احسانات کی ناشکری بھی، اور اپنے خالق و رازق اور مالک کے مقابلہ میں باغیانہ روش بھی۔

۱۳۔ یعنی پہلے تو ذرا یہ اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا؟ کس جگہ اس نے پرورش پائی؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا؟ اور کس بے بسی کی حالت سے دنیا میں اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی؟ اپنی اس اصل کو بھول کر یہ ہمجور ما دیگرے غیبت کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے اور کہاں سے اس کے دماغ میں یہ ہوا جھوٹی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آئے؟ (یہی بات ہے جو سورہ یس، آیات ۷۷-۸۰ میں فرمائی گئی ہے۔)

۱۴۔ یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر سٹے کر دی گئی۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ کیا ہوگا۔ اس کا قد کتنا ہوگا۔ اس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضاء کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہونگے۔ اس کی شکل صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہونگی۔ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اٹھے گا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اسے زمین پر کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی مہٹ نہیں سکتا، نہ اس میں ذرہ برابر رد و بدل کر سکتا ہے۔ پھر کسی عجیب ہے اس کی یہ جرأت کہ جس خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے اس کے مقابلہ میں کفر کرتا ہے۔

۱۵۔ یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سر و سامان جہیز نہ کر دیا

نہیں، اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھنے ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیتے ہوتے۔ مزید براں خالق نے اس کو یہ موقع بھی دے دیا کہ اپنے لیے خیر مائتہ، شکر یا کفر، طاعت یا عصیان کی جو راہ بھی یہ اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اُس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی یہ چلنا چاہے چلے۔

۱۷۔ یعنی اپنی پیدائش اور اپنی تقدیر کے معاملہ ہی میں نہیں بلکہ اپنی موت کے معاملہ میں بھی یہ اپنے خالق کے آگے بالکل بے بس ہے۔ نہ اپنے اختیار سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ اپنے اختیار سے مر سکتا ہے، اور نہ اپنی موت کو ایک لمحہ کے لیے بھی ٹال سکتا ہے۔ جس وقت، جہاں، جس حال میں بھی اس کی موت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اسی وقت، اسی جگہ اور اسی حال میں یہ مر کر رہتا ہے، اور جس نوعیت کی قبر بھی اس کے لیے طے کر دی گئی ہے اسی نوعیت کی قبر میں وہ ولایت ہو جاتا ہے، خواہ وہ زمین کا سیٹ ہو، یا سمندر کی گہرائیاں، یا آگ کا لاوہ، یا کسی دزدے کا معدنہ۔ انسان خود تو دو درکار، ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو کسی شخص کے معاملہ میں خالق کے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

۱۸۔ یعنی اس کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ خالق جب اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا چاہے تو یہ اٹھنے سے انکار کر سکے۔ پہلے جب اسے پیدا کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اس سے رائے نہیں لی گئی تھی کہ تو پیدا ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار بھی کر دیتا تو پیدا ہو کر رہتا۔ اسی طرح اب دوبارہ پیدائش بھی اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے کہ یہ مر کر اٹھنا چاہے تو اٹھے اور اٹھنے سے انکار کر دے تو نہ اٹھے۔ خالق کی مرضی کے آگے اس معاملہ میں بھی یہ قطعی بے بس ہے۔ جب بھی وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کو اٹھنا ہوگا، خواہ یہ راضی ہو یا نہ ہو۔

۱۹۔ حکم سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ولایت کر دیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرہ اور قدرت الہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے، اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا اور ہر دور کے صالحین کے ذریعے سے پھیلا یا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن،

ہم نے خوب پانی ٹنڈھایا، پھر زمین کو عجیب طرح چھاڑا، پھر اُس کے اندر اگاتے غلے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامانِ زمین کے طور پر۔

جلد پنجم، تفسیر سورہ دہر، حاشیہ ۵۔ اس سلسلہ بیان میں بتایا اس معنی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اوپر کہ آیتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کی بنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرمانبرداری کرتا، مگر اس نے الٰہی نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بندہ مخلوق ہونے کا جو تھا ضائع ہوا اور انکسار۔

غلے یعنی جس خوراک کو وہ ایک معمول کی چیز سمجھتا ہے، اُس پر ذرا غور تو کرے کہ یہ آخر پیدا کیسے ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو کیا انسان کے بس میں یہ تھا کہ زمین پر یہ غذا وہ خود پیدا کر لیتا؟

۱۵۔ اس سے مراد بارش ہے سورج کی حرارت سے بے حدود حساب مقدار میں مندروں سے پانی بھاپ بنا کر اٹھایا جاتا ہے، پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر سوائیں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں بھیلاتی ہیں، پھر عالم بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں از سر نو پانی کی شکل اختیار کرتی اور برعکاس میں ایک خاص حساب سے برسی ہیں، پھر وہ پانی براہِ راست بھی زمین پر برستا ہے، زیر زمین کنوول اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں بھی بہتا ہے، اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر گھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں بہتا ہے کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں؟ اُس کا خالق اُس کی رزق رسانی کے لیے یہ انتظام نہ کرتا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا؟

۱۶۔ زمین کو چھاڑنے سے مراد اُس کو اس طرح چھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی پتیاں انسان اُس کے اندر بوسے، یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعہ سے، یا کسی اور طریقے سے اُس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کہیں نہیں نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے، اور جو تخم خدائے پیدا کرنے والے ہیں، انہیں زمین کے اندر تار دیتا ہے اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں۔ اسی نے ان تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ چھوٹیں اور بہتر تخم سے اسی کی جنس کی نباتات اُگے۔ اور اسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور

آخر کار جب وہ کان پیر سے کر دینے والی آواز بلند ہوگی — اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ کچھ چہرے اُس روز دمک رہے

ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشوونما دے۔ یہ تخم ان خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدائش کی ہوتی تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پاسکتا تھا؟

۱۴۰ یعنی تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ ان جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمہاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اس سرد سامان سے مستمتع ہو اور جس خدا کے رزق پر چل رہے ہو اُسی سے کفر کرو؟

۱۴۱ مراد ہے آخری نفعِ صورت کی قیامت نیز آواز جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اٹھیں گے

۱۴۲ اس سے متعلقہ مضمون سورہ معارج آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ان عزیزوں کو، جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ کاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہو گا کہ یہ کم نعت اب ہمارے خلاف مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔

۱۴۳ احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہوں گے، ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور کلوٹس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔

اع

نے فرمایا: "قیامت کے روز سب لوگ ننگے پیچھے اٹھیں گے۔ آپ کی ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے (برود ایت بعض حضرت عائشہؓ نے، اور برود ایت بعض حضرت سہوہؓ نے اور برود ایت بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا: یا رسول اللہ! کیا ہمارے ستر اُس روز سب کے سامنے کھلے ہوں گے؟ حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا کہ اُس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا (نسائی، ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، طبرانی، ابن مَرْدُودِیہ، بیہقی، حاکم)۔"